جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ترجمان

ماہنامہ عزم

شمارہ مئی2026

اداریـــــــــــہ

یومِ مئی اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ حکمران طبقے نے کبھی بھی نیک نیتی یا دریا دلی کی بنیاد پر محنت کشوں کو حقوق نہیں دیے، بلکہ ہر کامیابی اور حق کو اجتماعی جدوجہد کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ دن ایک طرف منظّم تحریکوں کی تاریخی کامیابیوں کو یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف ان حالات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو ایسی جدوجہد کو مسلسل ضروری بنائے رکھتے ہیں۔

اس اداریے کی تحریر کے وقت خطے میں مختلف سطحوں پر احتجاج جاری ہیں۔ پونچھ یونیورسٹی کے طلبہ احتجاج کر رہے ہیں جس کے باعث کمپیوٹر سائنس کیمپس کی سرگرمیاں بند ہیں۔ ان کے ساتھ صحت کے شعبے سے وابستہ محنت کش اور ایڈہاک ملازمین بھی اپنے دیرینہ مطالبات کے حق میں متحرک ہیں۔ یہ واقعات الگ الگ نہیں ہیں بلکہ اس وسیع تر سماجی صورت حال کا حصہ ہیں جس میں تعلیم، صحت اور بنیادی خدمات مسلسل عدم استحکام، غفلت اور کمزور ڈھانچہ جاتی ترجیحات کے تحت چل رہی ہیں۔

جموں کشمیر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (JKNSF) ان تمام جاری جدوجہدوں کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کرتی ہے۔ طلبہ اور ایڈہاک ملازمین کے مطالبات اپنی نوعیت میں بنیادی ہیں اور ان روزمرہ حالات سے جڑے ہیں جو وقت کے ساتھ بگڑتے چلے گئے ہیں۔

اسی تسلسل میں کوٹلی یونیورسٹی کے طلبہ کی حالیہ ہڑتال اور ان کے مطالبات کی منظوری ایک اہم مثال ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منظّم اجتماعی عمل حالات پر اثر ڈال سکتا ہے اور ادارہ جاتی سطح پر ردعمل کو مجبور کر سکتا ہے۔ تاہم یہ کامیابیاں وقتی حد تک ہی محدود رہتی ہیں اور ان کے بعد مسائل کی واپسی ایک بار بار دہرایا جانے والا تجربہ بن چکی ہے۔

یونیورسٹیوں میں انفراسٹرکچر کے مسائل، بنیادی سہولیات کی کمی اور انتظامی بے عملی ایسے مسائل ہیں جو وقتی حل کے باوجود دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسئلہ صرف فوری مطالبات کا نہیں بلکہ اس طریقہ کار کا ہے جس کے تحت فیصلے کیے جاتے ہیں۔ مقامی سطح پر حقیقی اختیار اور جوابدہی کی کمی کے باعث ادارے اکثر صرف ردعمل دینے والی مشین بن کر رہ جاتے ہیں۔

یہ صورتحال ایک وسیع تر سیاسی اور ادارہ جاتی ڈھانچے سے جڑی ہوئی ہے جو فیصلہ سازی کو محدود اور غیر متوازن رکھتا ہے۔ نتیجتاً ادارے حقیقی معنوں میں خودمختار نہیں رہتے بلکہ ایک بڑے انتظامی فریم ورک کے اندر محدود کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بحران حل ہونے کے بجائے بار بار مختلف شکلوں میں واپس آتے رہتے ہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں موجودہ سماجی اور سیاسی حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔ موجودہ ڈھانچہ مسائل کو مستقل حل دینے کے بجائے انہیں وقتی طور پر سنبھالتا ہے، جس کے نتیجے میں عدم استحکام ایک معمول کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ان تضادات کا تسلسل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صرف جزوی اصلاحات کافی نہیں ہیں۔ اصل سوال ان ساختی حالات کا ہے جن کے اندر یہ مسائل بار بار جنم لیتے ہیں۔ اسی لیے جدوجہد صرف فوری مطالبات تک محدود نہیں رہ سکتی بلکہ اسے زیادہ منظّم اور مربوط سمت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یومِ مئی کی تاریخ

عمیر خورشید (ایڈیٹر عزم)

یومِ مئی کی تاریخ کو اگر چند معروف واقعات یا چند یادگار نعروں تک محدود کر دیا جائے تو اس کی اصل معنویت دھندلا جاتی ہے۔ یہ دراصل محنت، وقت اور پیداوار کے تعلق میں مسلسل بدلتی ہوئی کشمکشوں کی تاریخ ہے۔ سرمایہ داری کے پھیلاؤ نے صرف پیداوار کے پیمانے اور رفتار کو نہیں بدلا بلکہ انسانی وقت کو بھی ایک منظم اور قابلِ حساب شے میں تبدیل کر دیا۔ کام کے اوقات محض معاشی ضرورت نہیں رہے بلکہ طاقت، نظم اور منافع کے سوال سے جڑ گئے۔ اسی لیے یومِ مئی کی روایت کسی ایک واقعے یا ملک سے پیدا ہونے والی سیدھی لکیر نہیں بلکہ مختلف خطوں میں ابھرنے والی ان جدوجہدوں کا مجموعہ ہے جو الگ حالات میں جنم لینے کے باوجود ایک مشترک منطق کے تحت چلتی ہیں۔ اس تاریخ میں وقت صرف اس بات سے نہیں ناپا جاتا کہ مزدور نے کتنے گھنٹے کام کیا، بلکہ اس سے بھی کہ یہ حد کس نے مقرر کی، کیسے مقرر کی، اور اس پر تنازع کس صورت میں سامنے آیا۔

اس سلسلے کا ایک ابتدائی اور واضح نقطہ انیسویں صدی کے وسط میں میلبورن میں دکھائی دیتا ہے۔ اپریل 1856 میں یونیورسٹی آف میلبورن کے لیے کام کرنے والے پتھر تراش مزدوروں نے شدید گرمی کے دن کام روک دیا اور پارلیمنٹ کی طرف مارچ کیا، جہاں انہوں نے آٹھ گھنٹے کے کام کے دن کا مطالبہ رکھا۔ اس واقعے کی اہمیت صرف مطالبے میں نہیں بلکہ اس کے فوری نتائج میں بھی ہے۔ یہ مطالبہ بغیر اجرت میں کمی کے تسلیم کر لیا گیا اور ایک ماہ کے اندر یہی مزدور دوبارہ مارچ پر نکلے، اس بار احتجاج کے طور پر نہیں بلکہ جشن کے طور پر۔ بعد میں یہ سالانہ روایت میں بدل گیا اور یومِ مئی کی ابتدائی شکل اسی تسلسل میں نظر آتی ہے، اگرچہ اس کے پیچھے موجود معاشی حالات کو اکثر کم توجہ ملتی ہے۔

اس واقعے کو اگر ایک علیحدہ کامیابی سمجھا جائے تو اس کا سماجی سیاق گم ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں آسٹریلیا کا بڑا حصہ جبری مزدوری اور قیدی نظام پر قائم تھا۔ مزدور قوت منقسم اور سخت کنٹرول میں تھی، اور یونین سازی کی کوششوں کو سخت سزاؤں کے ذریعے روکا جاتا تھا۔ خوراک کی کمی اور کام کے حالات کے خلاف ابتدائی احتجاجوں پر کوڑوں اور قید کی صورت میں ردعمل دیا جاتا تھا۔ تاہم 1850 کی دہائی تک یہ ڈھانچہ بدل رہا تھا۔ قیدی مزدوری میں کمی آ رہی تھی اور خاص طور پر تعمیرات اور کان کنی کے شعبوں میں مہارت رکھنے والے مزدور نسبتاً نایاب ہو گئے تھے۔ اس تبدیلی نے طاقت کا توازن بدل دیا۔ میلبورن میں کامیابی کسی اچانک شعور کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس لمحے کی پیداوار تھی جب مزدوروں کی واپسی کو آسانی سے متبادل مزدوروں سے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہی بدلتا ہوا طاقت کا توازن بعد میں مختلف صنعتی مراکز میں بھی نئے تنازعات اور اجتماعی مزاحمت کی صورت میں سامنے آیا۔ شمالی امریکا میں تیزی سے پھیلتی ہوئی فیکٹری صنعت اور بڑے پیمانے کی اجرتی مزدوری نے اسی نوعیت کی کشمکش کو ایک زیادہ منظم اور پرتشدد شکل دی۔ اس کی ایک نمایاں مثال 1886 کا شکاگو ہے۔ پہلی مئی کو آٹھ گھنٹے کے کام کے دن کے حق میں ہونے والی ملک گیر ہڑتالیں بڑے پیمانے پر مظاہروں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس دوران پولیس اور ہڑتالی مزدوروں کے درمیان جھڑپوں میں ہلاکتیں ہوئیں، خاص طور پر مک کارمک فیکٹری کے باہر، جہاں دو مزدور مارے گئے۔ 4 مئی کو ہیمارکٹ اسکوائر میں احتجاجی اجتماع منعقد ہوا۔ جب پولیس نے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی تو ایک بم پھینکا گیا۔ اس کے بعد پولیس نے فائرنگ کی۔ اس واقعے میں کم از کم سات پولیس اہلکار اور چار مزدور ہلاک ہوئے، جبکہ درجنوں افراد زخمی ہوئے، اگرچہ حتمی تعداد کبھی مکمل طور پر واضح نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد جو قانونی کارروائی ہوئی وہ محض انصاف کا عمل نہیں تھی بلکہ طاقت کے اظہار کی ایک شکل تھی۔ مزدور رہنماؤں کو ایسے ماحول میں مقدمات کا سامنا کرنا پڑا جہاں ثبوت سے زیادہ سیاسی وابستگی اہم بن گئی تھی۔ جیوری کا انتخاب جانبدار تھا اور مقدمہ ایک ایسے سیاسی ماحول میں چلا جس میں مزدور

تحریک پہلے ہی مشکوک سمجھی جا رہی تھی۔ نتیجے میں کئی رہنماؤں کو پھانسی دی گئی۔

ہے مارکیٹ واقعہ نے یومِ مئی کو جنم نہیں دیا، لیکن اس نے اسے ایک ایسی علامتی یاد میں تبدیل کر دیا جو بین الاقوامی سطح پر پھیل گئی۔ اس نے ایک تاریخ کو قربانی اور ریاستی طاقت کے تصادم سے جوڑ دیا۔ آٹھ گھنٹے کا مطالبہ اب صرف انتظامی اصلاح نہیں رہا تھا بلکہ اس میں جبر، مزاحمت اور سیاسی طاقت کے سوالات شامل ہو گئے تھے۔

اسی دوران لندن میں ایک اور پیش رفت ہو رہی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں نیو یونین ازم کے تحت وہ مزدور بھی منظم ہونے لگے جنہیں پہلے غیر منظم سمجھا جاتا تھا، جن میں خواتین، تارکین وطن اور غیر ہنر مند مزدور شامل تھے۔

1889 تک دوسری انٹرنیشنل نے پہلی مئی کو عالمی مزدور دن کے طور پر منظم کر دیا۔ اس فیصلے نے مختلف براعظموں کی تحریکوں کو ایک مشترک علامتی فریم میں جوڑ دیا۔ اب یومِ مئی صرف یاد نہیں رہا تھا بلکہ ایک مشترک سیاسی عمل بھی بن گیا تھا۔

اس تاریخ کا ایک پیچیدہ پہلو یہ بھی ہے کہ بعد میں کئی ریاستوں نے اسے اپنایا جنہوں نے آزاد مزدور تحریکوں کو محدود یا ختم کیا۔ یورپ کی فاشسٹ حکومتوں نے یکم مئی کو سرکاری چھٹی کے طور پر برقرار رکھا لیکن آزاد یونینز کو ختم کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یومِ مئی کی علامتی قوت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کے مخالف نظام بھی اسے مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یومِ مئی کی روایت صرف میلبورن یا شکاگو سے نہیں سمجھ آتی۔ اس کے ساتھ ایسے مقامی واقعات بھی جڑے ہیں جو عالمی بیانیوں میں کم جگہ پاتے ہیں۔ ان میں سے ایک انیسویں صدی کے وسط میں کشمیر کا واقعہ ہے۔

اپریل 1865 میں سرینگر کے شال بُننے والے مزدوروں نے ڈوگرہ ریاست کے تحت نافذ ٹیکس نظام کے خلاف احتجاج کیا۔ شال صنعت سخت کنٹرول میں تھی اور پیداوار کے مختلف مراحل پر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، جس سے مزدور کی آمدن کا بڑا حصہ ریاست کے پاس چلا جاتا تھا۔ اسی دوران یورپی صنعتی پیداوار نے مشینی طریقوں سے کشمیری شالوں کی نقل شروع کر دی، جس سے روایتی صنعت کی طلب کم ہونے لگی۔ اس کمی کا بوجھ نیچے کی سطح پر منتقل کیا گیا اور ریاستی آمدنی برقرار رکھنے کے لیے ٹیکس مزید بڑھا دیے گئے۔

29 اپریل 1865 کو مزدوروں نے ایک جلوس نکالا جس میں ایک علامتی جنازہ بھی شامل تھا، جو اس معاشی نظام کی نمائندگی کرتا تھا جس میں ان کی محنت مسلسل گھٹتی ہوئی بقا کے دائرے میں قید تھی۔ ریاستی ردعمل سخت تھا۔ فوج نے فائرنگ کی، متعدد افراد ہلاک ہوئے، اور رہنماؤں کو قید، جلاوطنی یا تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ واقعہ ہے مارکیٹ سے بیس سال پہلے کا ہے، لیکن اس کے بنیادی عناصر وہی ہیں۔ منظم محنت، محدود آمدن، ریاستی جبر، اور عالمی معاشی تبدیلیوں کا مقامی اثر۔ یہ دکھاتا ہے کہ صنعتی سرمایہ داری کے پھیلاؤ نے مختلف خطوں میں مختلف شکلوں میں وہی تنازعات پیدا کیے۔

آٹھ گھنٹے کام کا دن، جسے ایک حاصل شدہ حقیقت سمجھ لیا جاتا ہے، آج بھی مکمل طور پر مستحکم نہیں ہے۔ کئی جگہوں پر رسمی حدیں موجود ہیں لیکن غیر رسمی اوور ٹائم، عارضی معاہدے اور ڈیجیٹل نگرانی کے ذریعے کام کا دائرہ دوبارہ پھیل جاتا ہے۔ کام اور غیر کام کے درمیان لکیر برقرار رہتے ہوئے بھی کم واضح ہو گئی ہے۔

اسی لیے ابتدائی تحریکوں کی منطق آج بھی متعلقہ رہتی ہے۔ ایلینور مارکس کے الفاظ میں یہ کافی نہیں کہ مطالبہ ایک دن کے لیے کیا جائے، بلکہ اسے روزمرہ زندگی اور تنظیم کے اندر جاری رکھنا ضروری ہے۔ یہ خیال اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ محنت کی سیاست صرف اوقات کی حد تک محدود نہیں رہتی بلکہ شرکت، نمائندگی اور طاقت کے ڈھانچے تک پھیل جاتی ہے۔

اسی منطق کے تحت آج کے مباحث آٹھ گھنٹے کے دن سے آگے بڑھ کر ہفتے میں چار دن کام کے جیسے تصورات تک پہنچ رہے ہیں۔ تاہم تاریخ یہ بھی دکھاتی ہے کہ وقت میں کمی اپنے آپ میں حتمی حل نہیں ہوتی۔ بغیر اجتماعی تنظیم اور فیصلہ سازی میں شمولیت کے یہ کمی دوبارہ شدت، نگرانی یا غیر رسمی توسیع کے ذریعے واپس لی جا سکتی ہے۔ یومِ مئی کی تاریخ اسی سوال کو بار بار سامنے لاتی ہے کہ کام کی رفتار، ساخت اور مقصد پر اصل اختیار کس کا ہے، اور یہ اختیار محض اوقاتِ کار کی تبدیلی سے نہیں بلکہ پیداواری وسائل کی بنیادی ملکیت اور اس کے ساتھ جڑی سماجی تنظیم کی مکمل تبدیلی کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔

عالمی بحران، جنگیں اور سرمایہ داری کا زوال

صائمہ بتول (چیئرپرسن شعبہ نشرواشاعت)

دنیا بھر میں تیزی سے رونما ہونے والے واقعات یہ واضح کرتے ہیں کہ انسانیت سرمایہ دارانہ نظام کے گہرے بحران میں داخل ہو چکی ہے۔ گزشتہ برس عالمی دولت کا بڑا حصہ اسلحے پر خرچ ہوا جبکہ لاکھوں بچے بھوک اور قابلِ علاج بیماریوں سے مر گئے، لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے اور ہزاروں معذور۔ آج جب دنیا کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو انسانیت کی بقا ہی خطرے میں محسوس ہوتی ہے، اور یہ کوئی حادثاتی صورتحال نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندرونی تضادات کا نتیجہ ہے۔

حالیہ برسوں میں مسلح تنازعات، پراکسی جنگیں، فوجی اتحادوں کی ٹوٹ پھوٹ اور اسلحہ سازی کی نئی دوڑ دنیا کو تباہی کی طرف دھکیل رہی ہے۔

ایران پر اسرائیلی جارحیت میں بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ انسانی حقوق کی تنظیم "ہرانا" کے مطابق جنگ کے آغاز سے اب تک 3 ہزار 636 افراد ہلاک ہوئے جبکہ پاور پلانٹس، سکولوں اور یونیورسٹیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ لبنان میں اسرائیلی حملوں میں تقریباً 1530 افراد جاں بحق ہوئے۔ غزہ میں 7 اکتوبر 2023 سے جاری جنگ کے دوران 46 ہزار 600 سے زائد فلسطینی ہلاک ہوئے اور دو لاکھ سے زیادہ مکانات تباہ ہوئے۔ غذائی قلت اور طبی سہولیات کی کمی نے بھی ہزاروں جانیں لیں، جن میں بڑی تعداد بچوں کی تھی۔

فروری 2022 سے جاری روس یوکرین جنگ میں اقوام متحدہ کے مطابق 12 ہزار 500 سے زائد یوکرینی شہری ہلاک اور 28 ہزار زخمی ہوئے، جبکہ جنگ نے دونوں ممالک کے لاکھوں فوجیوں کو بھی نگل لیا۔ مئی 2025 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تصادم نے سرحدی علاقوں، خصوصاً جموں کشمیر، میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی۔ لوگ ہجرت پر مجبور ہوئے اور سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان جھڑپوں میں بھی افغان شہریوں کی ہلاکتوں کی خبریں سامنے آئیں۔ جنگوں میں عام لوگوں کی اصل تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب ریاستوں کی اعلیٰ قیادت بھی خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتی تو عام عوام کی حالت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

ان جنگوں کے معاشی اثرات بھی تباہ کن ہیں۔ ایرانی حکومت کے مطابق جنگی نقصانات کا ابتدائی تخمینہ 229 بلین یورو لگایا گیا۔ ایران، جو 2025 میں دنیا کے بڑے سٹیل پیدا کرنے والے ممالک میں شامل تھا، آمدنی میں شدید کمی کے باعث ہزاروں مزدوروں کو فارغ کرنے پر مجبور ہوا۔ یہی صورتحال دوسرے شعبوں میں بھی دیکھی جا رہی ہے جہاں مزدور تنخواہوں میں کمی اور بے روزگاری کا شکار ہیں۔

عالمی معیشت بھی ایک طویل اور کثیر الجہتی بحران سے گزر رہی ہے۔ افراطِ زر، قرضوں اور طبقاتی عدم مساوات نے دنیا بھر کے محنت کشوں کی زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ پاکستان میں اجرتیں مہنگائی کے مقابلے میں تقریباً منجمد ہیں۔ بھارت میں کروڑوں لوگ بے روزگار ہیں جبکہ ایک چھوٹی اقلیت کی دولت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ امریکہ میں ایمازون، ٹیسلا اور میٹا جیسی کمپنیوں کے مالکان کی دولت میں کھربوں ڈالر کا اضافہ ہوا، جبکہ انہی کمپنیوں کے مزدور یونین سازی پر نوکریوں سے نکالے جا رہے ہیں۔

اسی دوران حکومتیں جنگی اخراجات اور امیروں کو ٹیکس رعایتیں دینے کے لیے صحت، تعلیم اور سماجی تحفظ پر کٹوتیاں کر رہی ہیں۔ برطانیہ میں قومی صحت کے ادارے کو نجکاری کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، فرانس میں پنشن اصلاحات کے خلاف لاکھوں افراد سڑکوں پر نکلے، جبکہ پاکستان میں تعلیم اور صحت کے بجٹ حقیقی معنوں میں سکڑ رہے ہیں۔ یہ الگ الگ پالیسیاں نہیں بلکہ ایک ایسے نظام کا لازمی نتیجہ ہیں جو منافع بچانے کے لیے عوام کا معیارِ زندگی گراتا ہے، پھر جنگوں کو ہوا دیتا ہے اور مزاحمت بڑھنے پر جمہوری ڈھانچوں کو کمزور کرتا ہے۔

جدید جنگوں کی تباہ کاری صرف بمباری اور فوری ہلاکتوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے اثرات برسوں تک انسانی زندگی، ماحول اور سماج پر ثبت رہتے ہیں۔ جنگیں معیشتوں کو کھوکھلا کرتی ہیں، وسائل کو تباہ کرتی ہیں اور محنت کش طبقات کو مزید عدم تحفظ، غربت اور بے یقینی کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ یہی بحران دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور مزاحمت کو جنم دے رہا ہے۔

اسی پس منظر میں 2025 اور 2026 کے دوران مزدور تحریکوں نے کئی دہائیوں کے بعد نئی شدت اختیار کی۔ برطانیہ میں میوزیم ورکرز، فیکٹری مزدور، صحافی اور ڈاکٹروں نے اجرتوں، پنشن اور برطرفیوں کے خلاف ہڑتالیں کیں۔ فرانس میں لاکھوں افراد پنشن اصلاحات اور بجٹ کٹوتیوں کے خلاف سڑکوں پر نکلے اور ہزاروں ہڑتالیں ریکارڈ ہوئیں۔ امریکہ میں سٹاربکس، ایمازون اور آٹو انڈسٹری کے مزدوروں نے بہتر اجرتوں اور یونین تسلیم کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر احتجاج کیے۔ بھارت میں فیکٹری مزدوروں اور gig معیشت سے وابستہ کارکنوں نے اجرتوں اور تحفظ کے مطالبات اٹھائے، جبکہ چین میں فوڈ ڈیلیوری اور ڈرائیورز نے الگورتھمک استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔

پاکستان میں فیصل آباد کے پاور لوم ورکرز کی ایک لاکھ سے زائد مزدوروں پر مشتمل ہڑتال اور کم از کم اجرت کے نفاذ کے مطالبات نے معاشی دباؤ کی شدت کو واضح کیا۔ پاکستانی اور بھارتی مقبوضہ جموں کشمیر میں بھی متعدد ہڑتالیں ہوئیں۔ پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتالوں نے بڑے شہروں کو مفلوج کیا، جبکہ ہیلتھ ملازمین اور عوامی ایکشن کمیٹی نے مختلف احتجاجی تحریکیں چلائیں۔ بھارتی مقبوضہ جموں کشمیر میں بھی زمینی قوانین، فائرنگ کے واقعات اور ٹرانسپورٹ مسائل کے خلاف ہڑتالیں ہوئیں۔

مارکس نے کہا تھا کہ سرمایہ داری اپنی ہی تضادات سے تباہ ہوگی۔ آج یہ تضادات کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ یہ نظام بے پناہ دولت تو پیدا کرتا ہے لیکن اکثریت کو اتنی قوتِ خرید نہیں دیتا کہ وہ اسی پیداوار کو خرید سکے۔ نتیجتاً نظام کو بار بار جنگوں اور مالی بحرانوں کے ذریعے اپنی اضافی پیداوار کو ضائع کرنا پڑتا ہے۔ 2008 کا مالی بحران، کورونا وبا کے دوران سپلائی چین کا ٹوٹنا اور آج کی جنگی معیشت اسی بحران کے مختلف اظہار ہیں۔ مگر ہر نئی تباہی پہلے سے زیادہ گہرے زخم چھوڑ رہی ہے۔

سرمایہ داری لامحدود ترقی کے فریب پر قائم ہے، لیکن اس نے وسائل چند ہاتھوں میں سمیٹ کر انسانیت کے لیے محدود کر دیے ہیں۔ آج انسانیت ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں یا تو یہ نظام ختم ہوگا یا پھر کرہ ارض مزید بربادی کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ روزا لکسمبرگ نے کہا تھا:
"بورژوا معاشرہ دوراہے پر کھڑا ہے، یا تو سوشلزم کی طرف منتقلی یا پھر بربریت و رجعت کی طرف۔"

جموں کشمیر: ٹریڈ یونینز پر پابندی محنت کشوں کی جدید غلامی!

آتش خان (سابق ایڈیٹر 'عزم')

جموں کشمیر میں ٹریڈ یونینز پر پابندی محنت کشوں کو اجتماعی تنظیم اور مزاحمت کے بنیادی حق سے محروم کرنے کی ایک منظم کوشش ہے۔ محنت کشوں کی اقتصادی جدوجہد کو مربوط اور منظم کرنے کے لیے ٹریڈ یونینز انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ٹریڈ یونینز نے محنت کشوں کے معیارِ زندگی میں بہتری لانے میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ محنت کشوں کی مناسب اجرتوں، سماجی و اقتصادی زندگی میں خواتین کی مساوی شرکت، بیماری کی صورت میں باماوضہ چھٹی، صحت و صفائی کی سہولیات، سماجی تحفظ اور بڑھاپے میں پنشن کے حق کے حصول میں ٹریڈ یونینز کی جدوجہد کا بنیادی کردار رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار حکمران طبقے اور افسر شاہی کے خلاف محنت کشوں کے پاس اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کی لڑائی کے لیے پہلا مورچہ ٹریڈ یونین ہوتی ہے، جہاں وہ منظم ہو کر مشترکہ مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ تاریخی طور پر بھی سرمایہ دار طبقے کے استحصال کے خلاف محنت کشوں کا ابتدائی اتحاد ٹریڈ یونین کی صورت میں نظر آتا ہے، جو آگے بڑھ کر انقلابی پارٹی کی شکل میں اپنا اعلیٰ اظہار کرتا ہے۔

1919 میں عالمی ادارہ محنت کے قیام سے دنیا بھر میں ٹریڈ یونین تحریک کو تقویت ملی۔ اس سے پہلے امریکہ میں 1794 میں فلاڈیلفیا کے جوتا ساز مزدوروں نے ابتدائی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ برصغیر میں باقاعدہ ٹریڈ یونین تحریک کا آغاز 1919 کے بعد تیزی سے ہوا۔ جموں کشمیر میں بھی محنت کش تحریک کی ایک اہم روایت موجود رہی ہے۔ 1944 میں کشمیر مزدور یونین کو مختلف ٹریڈ یونینز کی مرکزی تنظیم کے طور پر منظم کیا گیا، جس نے ریشم اور اونی ٹیکسٹائل صنعت سے وابستہ محنت کشوں کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تنظیم نے میونسپل ورکرز اور اونی ٹیکسٹائل کے محنت کشوں کے لیے اہم مراعات حاصل کیں جبکہ 1945 میں راجباغ کے سلک و یونگ فیکٹری کے کامیاب ہڑتال کی قیادت بھی کی۔ یہ تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ کشمیر کے محنت کش نہ صرف تنظیم سازی کی روایت رکھتے ہیں بلکہ اجتماعی جدوجہد کے ذریعے اپنے حقوق منوانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ جو حق برطانوی دور میں 1926 کے ٹریڈ یونین ایکٹ کے ذریعے برصغیر کے محنت کشوں کو ملا، وہ حق آج بھی پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر کے محنت کشوں کو حکمران طبقہ دینے کو تیار نہیں ہے۔

پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں ٹریڈ یونین پر پابندی عائد ہے۔ یہاں پیداواری شعبہ نہ ہونے کے برابر ہے جس کی وجہ سے اکثریتی محنت کشوں کا تعلق خدمات کے شعبے سے ہے۔ اس خطے کے محنت کش ایسوسی ایشنز کے ذریعے اپنے مطالبات پیش کرتے رہے ہیں اور ان کی منظوری کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ حکمران طبقے نے کشمیر ایمپلائز سروس ایسوسی ایشن (رجسٹریشن اینڈ ریگولیشن) ایکٹ، 2016 کے تحت ان ایسوسی ایشنز کو دوبارہ رجسٹریشن کروانے کا پابند کیا۔ اس ایکٹ کے مطابق ایسوسی ایشن کا کردار فلاحی سرگرمیوں تک محدود ہے اور یہ سروس ایسوسی ایشنز کو واضح طور پر منع کرتا ہے کہ وہ ہڑتال کریں یا اس کے لیے اکسائیں، لاک آؤٹ کریں یا سست روی اختیار کریں۔ اس ایکٹ کے مطابق اگر کوئی ایسوسی ایشن ہڑتال کا اعلان کرے تو

اسے بدانتظامی تصور کیا جائے گا اور اس کے تحت تادیبی کارروائی کی جائے گی، حتیٰ کہ محنت کشوں کو ملازمت سے بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ ایکٹ کے مطابق جو ملازم ہڑتال جاری رکھے وہ تنخواہ یا کسی قسم کے معاوضے کا حقدار نہیں ہوگا۔ مطالبات کی منظوری کے لیے ہڑتال، تالہ بندی یا سست روی کو 1898 کے ایکٹ V کے تحت جرم تصور کیا جا سکتا ہے۔

پاکستانی قوانین کے مطابق محنت کشوں کو بلا اجازت اور بلا امتیاز ٹریڈ یونین میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔ آئین کا آرٹیکل 17 نہ صرف انجمن سازی کی آزادی کو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی سودے بازی کو بھی بنیادی حق تصور کرتا ہے۔ آئین میں اٹھارویں ترمیم کی منظوری کے بعد صوبائی حکومتوں کو ان معاملات میں قانون سازی کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے بطور ممبر انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO) اس کے پاس کردہ کنونشنز میں سے 36 کنونشنز کی توثیق کی ہے، جن میں سے تقریباً 33 نافذ العمل ہیں۔ ان میں کنونشن نمبر 87 اجتماع کی آزادی اور کنونشن نمبر 98 منظم ہونے کا حق

اور اجتماعی سودے بازی سے متعلق ہیں۔

پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں محنت کش نہ صرف ٹریڈ یونین کے حق سے محروم ہیں بلکہ دیگر بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔ ٹریڈ یونین پر پابندی کے باعث وہ ان حقوق کے حصول کے لیے مؤثر جدوجہد بھی نہیں کر سکتے۔ نجی شعبے میں، بالخصوص نجی تعلیمی اداروں میں، حکومت کی مقرر کردہ کم از کم چالیس ہزار روپے اجرت کے مقابلے میں اس سے کہیں کم پر کام لیا جاتا ہے۔ بیماری یا کسی اور مجبوری میں چھٹی کرنے پر اجرت میں کٹوتی کی جاتی ہے۔ خواتین محنت کشوں کے پاس نجی تعلیمی اداروں کے علاوہ روزگار کے محدود مواقع ہیں، جہاں کم اجرت کے ذریعے ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور ملازمین کو بغیر کسی جواز اور نوٹس کے ملازمت سے فارغ کیا جا سکتا ہے۔ نجی اداروں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے پاس روزگار کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ریاستی اداروں میں کام کرنے والے محنت کشوں کی حالت بھی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر محکمہ ؟ برقیات میں ہر سال کئی محنت کش حفاظتی اقدامات اور مناسب سہولیات نہ ہونے کے باعث اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری اداروں میں نئے بھرتی ہونے والے ملازمین کی بڑی تعداد کنٹریکٹ اور ایڈہاک بنیادوں پر کام کر رہی ہے، جن کے پاس نہ روزگار کی ضمانت ہے اور نہ ہی پنشن اور دیگر مراعات۔

پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر کے محنت کشوں کو نہ صرف ٹریڈ یونین کے حق کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے محنت کشوں سمیت دنیا بھر کے محنت کشوں کے ساتھ یکجہتی کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کی مزدور دشمن نیولبرل معاشی پالیسیوں کے خلاف جدوجہد کو منظم کرنا چاہیے۔ آج حکمران طبقہ ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں سمیت دیگر قومی اداروں کی نجکاری کے ذریعے نہ صرف تعلیم اور صحت جیسے بنیادی حقوق کو محدود کر رہا ہے بلکہ روزگار اور پنشن کے تحفظ کو بھی کمزور کر رہا ہے۔ موجودہ معاشی حالات میں اصلاحات کی گنجائش محدود ہوتی جا رہی ہے، اس لیے ٹریڈ یونینز کا کردار محض اجتماعی سودے بازی تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ انہیں وسیع تر سماجی و معاشی تبدیلی کے لیے بھی اپنی جدوجہد کو منظم کرنا ہوگا۔ مشترکہ جدوجہد ہی محنت کشوں کے مفادات کے تحفظ کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

نوجوان، طلبہ سیاست اور عالمی مزاحمت کا نیا دور

فیضان عزیز (جوائنٹ سیکرٹری)

دنیا بھر میں حالیہ برسوں کے دوران ابھرنے والی عوامی تحریکوں اور بغاوتوں میں نوجوانوں اور طلبہ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ چاہے وہ نیپال اور بنگلہ دیش کی تحریکیں ہوں، فرانس میں پنشن اصلاحات کے خلاف احتجاج، امریکہ اور برطانیہ میں ابھرنے والی مزدور ہڑتالیں، یا فلسطین کے حق میں دنیا بھر کی جامعات میں ہونے والے طلبہ مظاہرے، ہر جگہ نوجوان سماجی و سیاسی بحران کے خلاف صفِ اول میں نظر آئے ہیں۔

ان تحریکوں نے یہ واضح کیا ہے کہ موجودہ عہد میں طلبہ سیاست صرف کیمپس کے مسائل تک محدود نہیں رہی بلکہ نوجوان اپنی زندگیوں، مستقبل، جنگ، معاشی استحصال، ریاستی جبر اور سماجی ناانصافی کے وسیع تر سوالات پر متحرک ہو رہے ہیں۔ پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں بھی حالیہ عوامی تحریکوں میں نوجوانوں کا کردار اسی عالمی رجحان کا حصہ ہے، جہاں ایک نئی نسل اپنے مستقبل، شناخت اور بنیادی حقوق کے سوالات کے ساتھ میدان میں اتر رہی ہے۔

پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں نوجوانوں کی ایک پوری نسل ایسے سماجی اور معاشی تضادات کے درمیان پروان چڑھ رہی ہے جہاں تعلیم کو نجات کا راستہ بھی

کہا جاتا ہے اور اسی تعلیم کے بعد سب سے عام سوال ہجرت کا ہوتا ہے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نوجوانوں کو ایک بہتر مستقبل کے خواب دکھائے جاتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں ان کے سامنے یا خلیجی ممالک کی محنت کی منڈیاں ہوتی ہیں، یا یورپ کی طرف غیر یقینی ہجرت کا راستہ۔ اس خطے میں تعلیم اکثر ایک ایسے سفر میں بدل جاتی ہے جس کا اختتام اپنی ہی سرزمین سے بے دخلی پر ہوتا ہے۔ یہی تضاد آج طلبہ سیاست اور نوجوانوں کی جدوجہد کو پہلے سے کہیں زیادہ اہم بناتا ہے۔

حکمران طبقہ اکثر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کشمیر میں شرحِ خواندگی بہت بلند ہے اور اسے اپنی کامیابی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر انہی سرکاری اعداد و شمار کی ساخت دیکھی جائے تو ایک مختلف حقیقت سامنے آتی ہے۔ سرکاری لیبر فورس سروے کے مطابق شرحِ خواندگی تقریباً 78 فیصد دکھائی جاتی ہے، مگر اس کی بڑی بنیاد "پری میٹرک" سطح کی تعلیم پر کھڑی ہے۔ یعنی اکثریت یا تو ابتدائی جماعتوں تک پہنچی یا میٹرک سے پہلے ہی تعلیمی نظام سے باہر ہو گئی۔ ڈگری اور اس سے اوپر کی تعلیم رکھنے والوں کی شرح انتہائی کم ہے جبکہ خواتین میں یہ تناسب مزید نیچے چلا جاتا ہے۔ اس طرح مجموعی شرحِ خواندگی کو بار بار دہرا کر ایک مصنوعی ترقی کا تاثر پیدا کیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت میں بڑی تعداد ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جو ادھوری تعلیم کے ساتھ محنت کی منڈی

میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔

خواتین طلبہ کی صورتحال اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود یا تو شادی کے بعد گھریلو قید اور انتظار کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیا پھر نجی سکولوں اور اکیڈمیوں میں انتہائی کم اجرت پر کام کرتی ہیں جہاں نہ کوئی جاب سکیورٹی موجود ہوتی ہے، نہ یونین سازی کا حق اور نہ ہی باعزت کام کے حالات۔ اس پورے نظام میں خواتین کی تعلیم کو بھی اکثر ایک آزاد انسان کی تشکیل کے بجائے صرف سماجی حیثیت یا شادی کے بازار سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔

طلبہ یونین پر پابندی جنرل ضیاء آمریت کے دور میں لگائی گئی تھی، مگر اس کے بعد آنے والی حکومتوں نے بھی اس پابندی کو ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا۔ اپوزیشن میں رہتے ہوئے تقریباً ہر مرکزی دھارے کی جماعت طلبہ یونین کی بحالی کے حق میں بیانات دیتی ہے اور نوجوانوں کے

جمہوری حقوق کی بات کرتی ہے، لیکن اقتدار میں آنے کے بعد یہی مطالبات پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ پاکستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں رسمی طور پر طلبہ یونینوں پر پابندی موجود نہ ہونے کے باوجود تعلیمی اداروں میں انتخابات نہیں کروائے جاتے۔

اس کی وجہ صرف انتظامی غفلت نہیں بلکہ حکمران طبقے کا خوف ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر نوجوان منظم ہونا شروع ہوئے تو ان کی جدوجہد صرف یونین انتخابات تک محدود نہیں رہے گی بلکہ وہ تعلیم، روزگار، طبقاتی استحصال، قومی سوال اور ریاستی جبر جیسے بڑے مسائل کو بھی چیلنج کریں گے۔

اسی لیے طلبہ سیاست کو صرف طلبہ یونین کے مطالبے تک محدود کر دینا کافی نہیں۔ یونینیں ایک بنیادی جمہوری حق ہیں، لیکن نوجوانوں کو درپیش مسائل اس سے کہیں زیادہ وسیع اور گہرے ہیں۔ ایک ایسا سماج جہاں نوجوانوں کی اکثریت ہجرت پر مجبور ہو، جہاں تعلیم کاروبار بن چکی ہو، جہاں خواتین تعلیم کے باوجود معاشی آزادی سے محروم ہوں، جہاں نصاب تنقیدی شعور کے بجائے اطاعت پیدا کرے، وہاں صرف انتخابات کروانے سے بحران حل نہیں ہوسکتا۔

ایسے حالات میں نوجوانوں کے لیے محض وقتی غصے یا محدود احتجاج کافی نہیں۔ منظم ہونا، سیاسی طور پر باشعور ہونا، اور اپنی جدوجہد کو ایک سائنسی نظریے اور واضح پروگرام کی بنیاد پر آگے بڑھانا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر نظریاتی وضاحت کے تحریکیں وقتی ابھار تو پیدا کر سکتی ہیں، لیکن سماج میں دیرپا تبدیلی نہیں لاسکتیں۔ آج کے عہد میں طلبہ سیاست کی اصل اہمیت یہی ہے کہ یہ نوجوانوں کو نہ صرف اپنے مسائل سمجھنے کا راستہ دیتی ہے بلکہ ان مسائل کی جڑوں کو پہچاننے اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے انہیں بدلنے کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہے۔

محنت کش خواتین: طبقاتی، معاشی اور سیاسی جبر

علیزہ اسلم (چیئرپرسن سٹڈی سرکل)

آج، جب سرمایہ داری اپنے گہرے اور نامیاتی بحران سے گزر رہی ہے، انسانی سماج کے رشتے، اقدار، ادارے اور سماجی ڈھانچے شدید ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہیں۔ اس بحران زدہ عہد میں، جہاں پورا معاشرہ بے یقینی اور ابتری کی کیفیت میں مبتلا ہے، وہاں سماج کے کمزور، محکوم اور استحصال کا شکار پرتیں سب سے زیادہ اذیت جھیل رہی ہیں۔

انہی استحصال زدہ پرتوں میں سب سے نمایاں محنت کش خواتین ہیں، جو دوہرے جبر اور ناانصافی کا سامنا کر رہی ہیں۔ سرمایہ دارانہ طبقاتی نظام میں عورت آج بھی بدترین محکومی، استحصال اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ دنیا بھر میں صنفی تفریق اور عورتوں پر جبر و تشدد کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں، جہاں ان کی محنت کو نہ معاشی قدر دی جاتی ہے اور نہ ہی سماجی اعتراف۔

اگر اس خطے، یعنی پاکستان کے زیر انتظام جموں و کشمیر، کے تناظر میں دیکھا جائے تو Development & Planning AJK Department کے 2025 کے سروے کے مطابق اس کی کل آبادی تقریباً 39.4 ملین ہے، جس میں تقریباً 21.2 ملین مرد اور 18.2 ملین عورتیں شامل ہیں۔ ان سرکاری اعداد و شمار کے مطابق خواتین آبادی کا تقریباً 49.2 فیصد حصہ ہیں، یعنی اس خطے کی نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے۔

اس کے باوجود یہ بڑی آبادی آج بھی بنیادی حقوق، مساوی مواقع، معیاری تعلیم، صحت کی سہولیات اور باعزت روزگار سے محروم ہے۔ ایک طرف اس خطے کی عورتوں کی زندگی کو طبقاتی استحصال، غربت، بے روزگاری اور معاشی پسماندگی نے دشوار بنا رکھا ہے، جبکہ دوسری طرف قومی جبر، سیاسی بے یقینی اور مسلسل عدم استحکام نے ان کے مسائل کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ یہاں کی عورتیں دوہرے نہیں بلکہ تہرے استحصال کا سامنا کر رہی ہیں۔ پدرشاہی سماجی ڈھانچہ، فرسودہ روایات اور معاشی نابرابری ان کی آزادی اور خودمختاری کی راہ میں بنیادی رکاوٹیں بنی ہوئی ہیں۔

پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں موجود مختلف شعبوں کی صورتحال دیکھی جائے تو وہاں بھی صنفی تفریق نظر آتی ہے۔ اگر تعلیم کے شعبے کی صورتحال کا جائزہ لیں تو وہ کافی تشویشناک ہے۔ اگرچہ شرح خواندگی میں اضافہ ہوا ہے، مگر خواتین کی شرح خواندگی اب بھی مردوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر کم ہے۔ خواتین کی کل شرح خواندگی 68% ہے جبکہ مردوں کی شرح خواندگی 88% ہے، 20% کا نمایاں فرق نظر آتا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خواتین کی بہت کم تعداد ہائیر ایجوکیشن حاصل کر پاتی ہے۔ بہت سی لڑکیاں ابتدائی تعلیم حاصل کرتی ہیں مگر اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے میں رکاوٹوں کا سامنا کرتی ہیں۔ دور دراز علاقوں میں کالجوں اور جامعات کی کمی، سفری مشکلات، غربت اور سماجی پابندیاں اس کی بڑی وجوہات ہیں۔ اسی طرح اگر روزگار کی بات کی جائے تو مردوں کی نسبت خواتین کو روزگار تک کم رسائی ہے۔ اگرچہ خواتین کل آبادی کا نصف ہیں مگر عملی معیشت اور باقاعدہ روزگار میں ان کی نمائندگی نہایت محدود ہے۔ جہاں خواتین کی لیبر فورس میں مردوں کے مقابلے کم شمولیت ہے، وہیں خواتین کی بڑی تعداد ایسی ہے جو گھریلو، زرعی اور غیر اجرتی کام انجام دیتی ہے مگر ان کے کام کی معاشی قدر کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

تعلیم یافتہ خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد ڈگریاں رکھنے کے باوجود بے روزگار ہے، جس کی بڑی وجہ اس نظام کی ناکامی ہے اور ساتھ ہی وہ روایات بھی ہیں جو ان کے پاؤں میں بیڑیوں کا کردار ادا کرتی ہیں۔ پدرشاہی سماجی ڈھانچے میں عورت کو محض ایک فرد کی بجائے ملکیت سمجھا جاتا ہے اور اسے چار دیواری میں محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دیہی علاقوں میں ہزاروں خواتین کھیتی باڑی، مویشی پالنے، سلائی کڑھائی، دستکاری اور گھریلو پیداوار میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، لیکن بدقسمتی سے ان کی محنت کا کوئی معاشی اعتراف موجود نہیں۔ اسی طرح سرکاری اداروں میں بھی خواتین کے لیے روزگار کے مواقع محدود ہیں۔ زیادہ تر خواتین نجی اداروں یعنی پرائیویٹ اسکولوں، کلینکس یا پرائیویٹ ہسپتالوں میں ملازمت کرتی ہیں جہاں ان سے محنت و مشقت تو کروائی جاتی

ہے، مگر اس کے برعکس کم اجرت، عدم تحفظ، ترقی کے کم مواقع اور ہراسانی جیسے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہ اس نظام کی ناکامی کا اظہار ہے کہ آج خواتین تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگاری کا شکار ہیں۔

اس مقبوضہ حصے میں اگر صحت کے شعبے کی صورتحال کا جائزہ لیں تو وہ بھی تسلی بخش نہیں۔ دور دراز کے علاقوں میں خواتین کے لیے ہسپتالوں، زچہ بچہ مراکز، ماہر ڈاکٹروں اور بنیادی طبی سہولیات کی کمی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ غذائی قلت، خون کی کمی، ذہنی دباؤ اور زچگی کے دوران خطرات آج بھی ہزاروں خواتین کی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں۔ یہاں گھریلو تشدد بھی ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ جسمانی تشدد، ذہنی دباؤ، مالی کنٹرول، جبری شادی، تعلیم یا نوکری سے روکنا یہ سب تشدد کی شکلیں ہیں جو یہاں موجود ہیں۔ بہت سی خواتین معاشی استحصال، سماجی دباؤ اور قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہوتی ہیں اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے سے ہچکچاتی ہیں۔ پدرشاہی خاندان عورت کو تابع رکھنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ سرمایہ دارانہ نظام اسی خاندانی ڈھانچے سے فائدہ اٹھاتا ہے کیونکہ اس سے مفت گھریلو محنت اور سماجی نظم برقرار رہتا ہے۔ جہاں اس خطے میں عورت کی معاشی اور سماجی قدر موجود ہے، وہیں سیاسی نمائندگی بھی محدود ہے۔

اس خطے میں خواتین نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مزاحمت اور جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا ہے، جن میں مہاراجہ کی شخصی حکمرانی کے خلاف تحریکیں بھی شامل ہیں۔ تاہم انفرادی سطح پر اس شمولیت کے باوجود انہیں اجتماعی سیاسی عمل اور باقاعدہ سیاست کے مرکزی دھارے سے مسلسل دور رکھا گیا ہے۔

اگر روایتی سیاسی جماعتوں کی بات کی جائے تو انہوں نے خواتین کی نمائندگی کو زیادہ تر خواتین ونگز تک محدود رکھا ہے، اور بہت کم مواقع پر خواتین کو حقیقی فیصلہ سازی کے عمل میں شامل کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب قوم پرست اور ترقی پسند تنظیمیں بھی آبادی کے نصف حصے کو مؤثر طور پر مکمل طور پر شامل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ان تنظیموں میں خواتین کو اکثر علامتی نمائندگی تو دی جاتی ہے، مگر فیصلہ سازی کے مراحل میں ان کی رائے کا مؤثر کردار نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر سیاست میں خواتین کی نمائندگی اب بھی نہایت محدود ہے۔

اسی خطے میں جب بڑی تحریکیں ابھرتی ہیں تو خواتین بھی ان میں شامل ہوتی ہیں، لیکن اکثر انہیں اندرونی سطح پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات انہیں مختلف سماجی لیبلز کے ذریعے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم کوئی بھی تحریک آبادی کے نصف حصے کو شامل کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جہاں خواتین کو طویل عرصے تک سیاست اور سڑکوں سے دور رکھا گیا، آج انہیں وقتی معاشی مراعات کے لیے متحرک کیا جاتا ہے اور بعد میں انتخابی عمل میں دوبارہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس خطے میں سیاسی عمل میں خواتین کی شرکت کو اب بھی منفی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور روایتی تصورات ان کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود خواتین نے ہر تحریک میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

اگرچہ خواتین کے لیے اسمبلی میں 05 مخصوص نشستیں موجود ہیں، مگر یہ نمائندگی محنت کش عورتوں کی حقیقی آواز تک نہیں پہنچتی۔ زیادہ تر نمائندگی مراعات یافتہ طبقوں، بااثر خاندانوں یا سیاسی اشرافیہ کے پاس ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قانون سازی میں محنت کش خواتین کے مسائل اکثر نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ یہ مخصوص نشستیں عملی طور پر محنت کش عورتوں کی نمائندگی کے بجائے ایک رسمی ڈھانچہ بن چکی ہیں۔

عورت کی نجات صرف اصلاحات سے ممکن نہیں، بلکہ اس سماجی و معاشی ڈھانچے کی تبدیلی سے ممکن ہے جہاں وسائل چند ہاتھوں میں مرکوز ہیں۔ جب تک پیداوار کے ذرائع چند طبقات کے قبضے میں رہیں گے، تب تک استحصال برقرار رہے گا۔

عورت کی آزادی صرف قومی سوال تک محدود نہیں کی جا سکتی، بلکہ یہ ایک وسیع تر سماجی اور معاشی سوال ہے۔ ایک ایسے سماج میں ہی حقیقی آزادی ممکن ہے جہاں معیشت منافع کے بجائے انسانی ضرورت کے مطابق چلائی جائے۔ تعلیم، صحت، روزگار، رہائش اور دیگر بنیادی سہولیات سب کے لیے یکساں ہوں۔ اجتماعی سہولیات جیسے ڈے کیئر، کمیونل کچن اور سماجی نگہداشت عورت کو گھریلو بوجھ سے آزاد کر سکتی ہیں۔ ایسے نظام میں عورت صرف معاشی طور پر نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی طور پر بھی برابر کی شریک ہوگی۔ وہ یونینز، تحریکوں اور اداروں میں فعال کردار ادا کرے گی۔ یہی سمت سوشلسٹ مستقبل کی طرف جاتی ہے، اور یہی عورت کی مکمل آزادی کا راستہ ہے۔

غلامی سے اجرت تک: نوآبادیات کے معاشی زخم اور ہجرت

ارسلان شانی (سیکرٹری جنرل)

ہجرت آج کے دور کا ایک ایسا انسانی مسئلہ ہے جو دنیا کے ہر خطے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ کروڑوں لوگ اپنے وطن سے دور زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، جبکہ ہر سال ہزاروں افراد ایسے خطرناک راستوں میں اپنی جان گنوا دیتے ہیں جہاں نہ منزل یقینی ہوتی ہے اور نہ واپسی ممکن۔

بین الاقوامی تنظیم برائے ہجرت کے مطابق، 2025 کے دوران دنیا بھر کے ہجرت کے راستوں پر تقریباً 7 ہزار 904 اموات اور گمشدگیاں ریکارڈ کی گئیں، جو اس عالمی ناکامی کی عکاسی کرتی ہیں کہ ان قابلِ تدارک اموات کو روکا نہیں جا سکا۔ ادارے کے "مسنگ مائیگرنٹس پراجیکٹ" کے مطابق 2014 سے اب تک 80 ہزار سے زائد افراد ہجرت کے دوران جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا لاپتہ ہو گئے ہیں۔ تاہم ادارہ خبردار کرتا ہے کہ یہ اعداد و شمار اصل تعداد کا محض کم از کم اندازہ ہیں، کیونکہ بہت سے واقعات رپورٹ ہی نہیں ہو پاتے۔

مزید برآں، اس بحران کے اثرات صرف ہلاک یا لاپتہ ہونے والے افراد تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کے خاندان بھی شدید متاثر ہوتے ہیں۔ اندازوں کے مطابق کم از کم 3 لاکھ 40 ہزار خاندان اپنے پیاروں کی گمشدگی کے باعث نفسیاتی، سماجی، قانونی اور معاشی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عالمی معیشت کے پہیے کو حرکت دیتے ہیں، مگر خود غیر یقینی اور عدم تحفظ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

کارل مارکس نے محنت کش طبقے کے بارے میں جو بات کہی تھی، وہ آج پہلے سے زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ محنت کش کے پاس اپنی محنت بیچنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا، کیونکہ اسے ذرائعِ پیداوار کی ملکیت سے محروم رکھا جاتا ہے، اور جب اس کے اپنے خطے میں روزگار ختم ہو جائے تو وہ سرحدوں، زبان اور ثقافت کی رکاوٹوں سے بے نیاز ہو کر کہیں بھی جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یوں ہجرت صرف خواہش نہیں بلکہ بقا کی جدوجہد بن جاتی ہے۔

پاکستانی مقبوضہ جموں و کشمیر میں یہ حقیقت نہایت واضح ہے۔ یہاں ہجرت کوئی وقتی رجحان نہیں بلکہ ایک مستقل معاشی ڈھانچے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اندازوں کے مطابق تقریباً 20 لاکھ کشمیری بیرون ملک مقیم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 45 لاکھ سے زائد آبادی رکھنے والے اس خطے کی ایک بڑی تعداد اپنی روزی روٹی کے لیے اپنے وطن سے باہر رہنے پر مجبور ہے۔ یہاں اصل سوال یہ نہیں کہ لوگ کیوں جا رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ کیوں نہیں رک سکتے۔

اگر ہم صرف پاکستانی مقبوضہ جموں و کشمیر کو دیکھیں تو یہ خطہ قدرتی وسائل، معدنیات، جنگلات اور پانی سے مالا مال ہے۔ اگر یہاں صرف سیاحت کے فروغ کی مؤثر منصوبہ بندی کی جائے تو ایسا زرکمایا جا سکتا ہے جس سے اس خطے کو نمایاں حد تک غربت سے نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس خطے پر نوآبادیاتی طرزِ حکومت، جسے مقامی سہولت کاروں کے ذریعے برقرار رکھا گیا ہے، کی وجہ سے مقامی معیشت کی کمزوری اس مجبوری کی بنیاد بنتی ہے۔ نہ صنعت موجود ہے، نہ زراعت جدید بنیادوں پر استوار ہے اور نہ ہی روزگار کے نئے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں۔ سرکاری نوکریاں محدود ہیں اور اکثر تعلقات سے جڑی ہوتی ہیں، جبکہ نجی شعبہ انتہائی کمزور ہے۔ ایسے حالات میں نوجوان کے پاس یا تو بے روزگاری کا راستہ بچتا ہے یا ہجرت کا۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک جانا اس معاشرے میں ایک عام اور قابل قبول راستہ بن چکا ہے۔

لیکن اس ہجرت کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور وہ ہے ان محنت کشوں کی عملی زندگی۔ وہ کبھی یورپ کی سرد ہوائیں جھیل رہے ہوتے ہیں اور کبھی عرب کے تپتے صحراؤں میں اپنی محنت کم اجرت پر فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر اور دیگر ممالک میں جانے والے زیادہ تر کشمیری مزدور کم اجرت پر نہایت سخت حالات میں کام کرتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد تعمیرات، صفائی، ڈرائیونگ، سیکیورٹی اور دیگر محنت طلب کاموں سے وابستہ ہوتی ہے، جہاں انہیں طویل اوقاتِ کار، شدید گرمی، غیر معیاری رہائش اور بنیادی سہولیات کی کمی کا سامنا رہتا ہے۔

بعض اوقات ان کے پاسپورٹ ضبط کر لیے جاتے ہیں، اجرت میں تاخیر یا کٹوتی معمول بن جاتی ہے، اور شکایت کے مؤثر نظام تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ وہ قانونی اور سماجی طور پر کمزور حیثیت میں ہوتے ہیں، جس کے باعث استحصال کے خلاف آواز اٹھانا ان کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ کئی محنت کش بھاری قرض لے کر بیرون ملک جاتے ہیں اور ابتدائی مہینوں بلکہ بعض اوقات سالوں تک صرف قرض اور سود اتارنے میں ہی لگ جاتے ہیں۔ اس دوران اگر نوکری ختم ہو جائے یا آجر بدل دے تو ان کے پاس نہ کوئی سہارا ہوتا ہے اور نہ واپسی کا محفوظ راستہ۔

کام کی جگہوں پر حفاظتی انتظامات کی کمی کے باعث حادثات عام ہیں، جبکہ شدید موسم اور مسلسل مشقت ان کی صحت کو تیزی سے متاثر کرتی ہے۔ اکثر محنت کش تنگ و تاریک کمروں میں رہتے ہیں جہاں ایک ہی کمرے میں کئی کئی افراد ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ ناقص خوراک، صاف پانی کی کمی اور آرام کے فقدان کے باعث جسمانی کمزوری، دل اور سانس کی بیماریوں، جلدی امراض اور ذہنی دباؤ عام ہو جاتا ہے۔ تنہائی، گھر والوں سے دوری اور غیر یقینی مستقبل کی فکر انہیں ذہنی طور پر بھی توڑ دیتی ہے، مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پیچھے ایک پورا خاندان ان پر انحصار کر رہا ہوتا ہے۔

یوں جو ہجرت باہر سے ایک کامیابی اور خوشحالی کا راستہ دکھائی دیتی ہے، اس کے پیچھے ایک نہایت کڑی اور تلخ حقیقت چھپی ہوتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں انسان صرف اپنی محنت ہی سستے داموں نہیں بیچتا بلکہ اپنی عزت، وقت، صحت اور جوانی کے بہترین سال بھی قربان کر دیتا ہے۔

اس اذیت ناک زندگی کے باوجود بیرونِ ملک مقیم کشمیری ہر سال بڑی مقدار میں زرِ مبادلہ اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں۔ اسی کمائی سے یہاں کے گھروں کے چولہے جلتے ہیں، علاج معالجہ کا بندوبست ہوتا ہے، بچوں کی تعلیم جاری رہتی ہے، شادیاں ہوتی ہیں اور رہائش کے مسائل کسی حد تک حل ہو پاتے ہیں۔ گویا اس خطے کی روزمرہ زندگی کا ایک بڑا انحصار انہی ترسیلات زر پر قائم ہے۔

پاکستان کو مجموعی طور پر 30 ارب ڈالر سے زائد سالانہ ترسیلاتِ زر موصول ہوتی ہیں، جن میں ایک نمایاں حصہ کشمیریوں کا بھی شامل ہے۔ اس طرح ایک انحصاری معاشی چکر وجود میں آتا ہے جس میں یہ خطہ اپنی بقا کے لیے بیرونی آمدن پر انحصار کرتا ہے، مگر اسی آمدن کو اپنی مقامی معاشی ترقی، صنعتی بنیاد کے قیام یا پائیدار روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے منظم انداز میں استعمال نہیں کر پاتا۔

اگر یہاں ایک خودمختار اور مقامی ضروریات سے ہم آہنگ مالیاتی ادارہ، مثلاً ریاستی سطح کا خودمختار بینکاری نظام، موجود ہو تو اسی رقم کو مقامی ترقی کے لیے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً سیاحت جیسے شعبے میں، جہاں قدرتی وسائل پہلے ہی موجود ہیں، مقامی افراد کو آسان اقساط پر قرضے فراہم کر کے روزگار کے نئے مواقع پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اس عمل کی ایک بڑی سماجی قیمت بھی ہے۔ خاندان بکھر جاتے ہیں، بچے اپنے والدین سے دور ہو جاتے ہیں اور نوجوان اپنی زندگی کے اہم سال پردیس میں گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دیہات میں اکثر گھر خالی رہ جاتے ہیں یا صرف بوڑھے افراد اور خواتین رہ جاتی ہیں۔ یہ ایک خاموش سماجی ٹوٹ پھوٹ ہے جو معاشرے کی بنیادوں کو اندر ہی اندر کمزور کرتی رہتی ہے۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جموں و کشمیر کی ہجرت کوئی الگ تھلگ یا وقتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک بڑے عالمی معاشی نظام کا حصہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کو سستی محنت درکار ہوتی ہے، جبکہ پسماندہ خطوں میں روزگار کے مواقع محدود رکھے جاتے ہیں اور شعوری طور پر کمزور کیے جاتے ہیں۔ اس عدم توازن کے نتیجے میں محنت کش اپنی بقا کی خاطر انہی ممالک کا رخ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

آخر کار اصل سوال سرحدوں کا نہیں بلکہ معاشی و سیاسی نظام کا ہے۔ جب تک مقامی سطح پر روزگار کے حقیقی مواقع پیدا نہیں کیے جاتے، معیشت کو خود کفالت کی بنیاد نہیں ملتی اور وسائل کی منصفانہ تقسیم ممکن نہیں بنائی جاتی، تب تک انسان اپنے گھروں، اپنی مٹی اور اپنے سماج سے دور جانے پر مجبور رہیں گے۔

اسی تناظر میں اگر مقامی سطح پر حقیقی سیاسی و معاشی اختیار مضبوط کیا جائے تو ہجرت کو مجبوری کے بجائے ایک حقیقی انتخاب میں بدلا جا سکتا ہے۔ بصورت دیگر، یہ رجحان اسی طرح جاری رہے گا اور پورا خطہ اپنی معاشی بقا کے لیے بیرونی دنیا پر انحصار کرتا رہے گا۔

یوں واضح ہے کہ ہجرت اس وقت تک ایک مجبوری ہی رہے گی جب تک اس کے بنیادی معاشی اسباب کو دور نہیں کیا جاتا۔

احساسِ کامراں(نظم)

شاعر: ساحرلدھیانوی

سالہاسال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزم آزادءِ انساں بہ ہزاراں جبروت
اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے
برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں
سرخ طوفان کی موجوں کے جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیر گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

عثمان عزیز کی جدوجہد کو خراج عقیدت

مرکزی کابینہ (جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن)

24 مئی 2022 کو جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق مرکزی ڈپٹی چیف آرگنائزر کامریڈ عثمان عزیز ایک المناک حادثے میں ہم سے جدا ہو گئے۔ ان کی برسی کے موقع پر ہم اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ کامریڈ عثمان عزیز کی انقلابی جدوجہد کو اسی جذبے اور تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا جائے گا۔ خودغرضی، مصلحت پسندی اور مفاد پرستی کے اس دور میں کامریڈ عثمان عزیز جیسے انقلابی کردار امید کی روشن مثال بن کر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی نوآبادیاتی جبر، استحصال اور طبقاتی نظام کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کر دی اور سائنسی سوشلزم کے نظریات کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

کامریڈ عثمان عزیز نے نہ صرف خود شعور حاصل کیا بلکہ نوجوانوں میں بھی سیاسی و نظریاتی بیداری پیدا کی۔ وہ ہر مشکل اور نامساعد حالات میں ثابت قدم رہے۔ ان کی سادگی، نظریاتی وابستگی اور تنظیمی محنت نے انہیں ایک منفرد مقام عطا کیا۔ ان کی جدوجہد اور قربانیاں اس بات کا واضح پیغام ہیں کہ ظلم کے خلاف مزاحمت ہی اصل خراجِ عقیدت ہے۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر ہم سے جدا ہو چکے ہیں، لیکن ان کے نظریات، حوصلہ اور مشن آج بھی زندہ ہیں اور ہمیں ایک بہتر اور منصفانہ نظام کے قیام کے لیے نوآبادیاتی قبضے کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔